تعلیمی اداروں کی ثقافت: چند تاملات

عبدالقدیر سلیم

بھلا تم نے دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے' جیسے ایک پاکیزہ درخت' جس کی جڑ زمین میں مضبوطی سے پیوست ہو' اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہوں۔ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر آن اپنے پھل دیتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے یہ مثالیں اس لیے دیتا ہے کہ وہ ان سے سبق لیں۔ اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدنہاد درخت کی سی ہے' جسے زمین پر سے اکھاڑ دیا گیا ہو' اس کے لیے کوئی جائے قرار نہیں۔ (ابراھیم ۱۴: ۲۴-۲۶)

انسانی معاشرے کو دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے' ایک تو یہ کہ یہ ایک زندہ جسم' ایک عضویہ ہے' نمو پذیر یا زوال آمادہ۔ یہ چند انسانوں کے میل جول سے جنم لیتا ہے' پھلتا پھولتا اور ترقی کرتا ہے' بڑھتا اور سنورتا ہے' اور یا پھر ان میں انتشار اور منافقتوں کے نتیجے میں انحطاط کا شکار ہو کر بکھرنے لگتا ہے' اور اس کے خلیے (افراد) منتشر ہونے لگتے ہیں' ان کا باہمی ربط ختم ہونے لگتا ہے' جس سے اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

معاشرے کی دوسری صورت گری (حالیہ) یوں کی گئی ہے کہ یہ دراصل انسانوں کے درمیان ایک رشتوں کے تانے بانے (total network) یا جال کا نام ہے' اور اس طرح معاشرے کے اجزا' افراد کا نہیں' بلکہ ان کے درمیان علائق (رشتوں) سے وجود میں آتے ہیں۔ افراد' اس تانے بانے کے محض مراکز (foci) ہوتے ہیں۔

ثقافت اور اس کے مفہوم و مظاہر پر بہت گفتگو ہو چکی ہے۔ مگر میں اپنی معروضات پیش کرنے سے پہلے اس کی ایک تعریف کو سامنے رکھنے کی کوشش کروں گا' تاکہ اگلی گزارشات کو اس کی روشنی میں دیکھنے کی

پروفیسر عبدالقدیر سلیم' انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن' کراچی' میں وزٹنگ پروفیسر ہیں۔

کوشش کی جا سکے۔ میرے خیال میں کسی قوم یا اجتماع کی ثقافت اس کے افراد کے کردار یا طرز عمل کی یکسانیتوں پر مشتمل ہوتی ہے، جن کی عکاسی ان کے درمیان پائے جانے والے علائق سے ہوتی ہے۔ پھر یہ یکسانیتیں خارجی بھی ہوتی ہیں، اور داخلی بھی اور یہی یکسانیتیں، اس قوم یا معاشرے یا گروہ کو دوسری اقوام، معاشروں اور گروہوں سے متمیز کرتی ہیں۔ تاہم افراد کے درمیان وہ یکسانیتیں، جو ان کی حیاتیاتی اور طبعی اوصاف کو ظاہر کرتی ہیں، انھیں ثقافت کا حصہ تصور نہیں کیا جا سکتا، جیسے کسی علاقے کے لوگوں کا رنگ، قد کاٹھ اور ناک نقشہ ان کی ثقافت کا حصہ نہیں ہیں۔

اس تعریف میں کردار کی جن خارجی یکسانیتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا تعلق رہن سہن، خورد و نوش، لباس و زیبایش اور اس طرح کے دوسرے خارجی مظاہر سے ہے، جب کہ داخلی یکسانیتوں میں ہم ایک گروہ کے مخصوص "نظام اقدار" کو شامل کر سکتے ہیں۔ میں گمان کرتا ہوں کہ کسی قوم یا گروہ کے مخصوص عقائد، ایمانیات، امنگیں اور آرزوئیں، پسند و ناپسند، رد و قبول کے معیارات بھی اس کی مخصوص ثقافت کا ویسا ہی، بلکہ زیادہ عمیق اور وزنی (profound) جزو ہیں، جیسا کہ اس کے ظروف اور آداب طعام و لباس۔ کیوں کہ یہ داخلی رجحانات ہی دراصل اس کے خارجی میلانات کو متعین کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مختلف طبعی اور جغرافیائی احوال و ظروف میں ان کے اظہارات میں اختلافات اور بوقلمونی نظر آتی ہو۔

اس وقت پاکستان میں بالفعل تین چار طرح کے نظام تعلیم مروج ہیں، اور ان کے ذیل میں چھ سات قسم کے تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ کراچی کے امریکن اور گرامر اسکول جیسے اداروں کا نصاب اور نظام تعلیم کلیتاً بدیسی ہے، اور اس کا پاکستانیت یا اسلام کے ساتھ کسی طرح کوئی بھی رشتہ نہیں۔ پھر دوسرے درجے میں نہایت گراں انگریزی میڈیم اسکول ہیں، جو طلبہ کو "او لیول" اور "اے لیول" کے لیے پڑھاتے ہیں۔ پھر محلوں میں گلی گلی، تیسرے اور چوتھے درجے کے نام نہاد انگلش میڈیم اسکول ہیں۔ پھر سرکاری (پیلے) اسکول ہیں (عموماً اردو میڈیم یا مقامی زبانوں میں تعلیم دینے والے)۔ تعلیمی اداروں کا ایک سلسلہ پبلک اسکولوں کا بھی ہے (نیم سرکاری) جنھیں سرکاری امداد بھی ملتی ہے، لیکن عموماً مراعات یافتہ طبقے ہی کی ان تک رسائی ہے، اور کم ہی دوسرے بچے وہاں تک پہنچ پاتے ہیں۔ ایک سلسلہ عیسائی مشنری اسکولوں کا بھی ہے، ان کے بھی مختلف طبقات اور درجے ہیں، غریب بستیوں میں ان کے اسکول کوئی خاص معیاری نہیں، جب کہ امرا کی اولاد کے لیے گراں اور بہتر معیار کے اسکول قائم کیے گئے ہیں۔ پھر ایک سلسلہ تعلیم دینی مدارس کا ہے۔ ان کے بھی کئی درجات اور الوان ہیں۔ دور افتادہ گاؤں اور پس ماندہ علاقوں میں نہایت قلیل وسائل سے کام کرنے والے مدارس، اور بڑے شہروں میں بڑے بڑے اور باوسیلہ مدارس ہیں۔ ان مدارس میں بھی مختلف فقہی مکاتب اور مسالک کے الگ الگ رنگ ہیں۔ ان سب اداروں کا اپنا اپنا کلچر ہے، اور پھر ہماری ثقافت کے

متغیراور متلون رنگوں نے بھی ہمارے مدارس پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اور اس کی عکاسی ہر جگہ نظر آتی ہے مگرایسا کیوں ہے؟

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ تعلیمی پالیسی مرتب کرنے والے یا کم از کم اس پر اثرانداز ہونے والے عمومی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں: اولاً برسراقتدار آنے والے وہ حکمراں (سیاست داں) ہیں جو تعلیم کی حرکیات کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے' نہ ان کی صفوں اور جماعتوں میں کوئی ایسے ماہرین اور دانش ور ہی موجود ہیں' جو انھیں تعلیمی اداروں کے مطلوبہ رنگ و آہنگ اور انسان سازی کے اصل اہداف اور طریقوں سے آگاہ کر سکیں' اور ان کے ذہنوں میں مطلوبہ اہداف کے حصول کی لگن پیدا کر سکیں۔ کیوں کہ ان کے اپنے کوئی مراجع فکر (think tank) ہیں ہی نہیں' نہ انھیں ان کی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بات بھی اہم ہے کہ تعلیم' اور خصوصاً ابتدائی تعلیم کے ادارے اور مدارس ان کی توجہ اور ترجیحات میں بہت ہی نیچے مقام رکھتے ہیں۔ تعلیم' ان کی نظر میں بس اس لیے اہم ہے کہ اس کے ذریعے مطلوبہ تعداد میں ہنرمند اور مختلف مہارتوں کے ماہرین میسر آ جائیں۔ اس بات کو ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہماری سیاسی ہیئت مقتدرہ' تعلیم' خصوصاً ابتدائی تعلیم کو اپنی توجہ کے لائق ہی تصور نہیں کرتی' اور انسان سازی اس کے نزدیک ایک بے معنی ہدف ہے۔ اسی لیے متنوع تعلیمی اداروں کا کلچر' خود رو جنگل کی طرح اگتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔

تعلیم کی ساخت اور ہیئت کو متعین کرنے والا دوسرا گروہ' ان نام نہاد ماہرین تعلیم کا ہے' جو حکمرانوں کی فرمایش پر' ان کی خواہش کے مطابق (یا کم از کم ان کی خواہش سے غیر متصادم) اور ان کی مقرر کردہ حدود و اہداف کے مطابق وقتاً فوقتاً تعلیمی پالیسیاں مرتب کرتے ہیں۔ یہ لوگ تعلیم' اس کی اہمیت' اس کی حرکیات اور ایک قوم' ایک معاشرے اور ایک خاندان کے لیے تعلیم کی اہمیت اور اس کے دور رس نتائج سے بالکل بے بہرہ تو نہیں ہوتے' لیکن بدقسمتی سے اب' جب کہ وہ قوم کے اور اس کے بچوں کے مستقبل کے لیے خاکے اور نقشے مرتب کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں' تو خود ان کے مفادات قومی اور عوامی مفادات سے ہم آہنگ نہیں ہوتے' اس لیے اس کار خیر میں دلی لگن کے ساتھ شرکت اور اس کے لیے حقیقی جذبہ یہاں مفقود ہوتا ہے۔ اور جہاں ان کے مفادات ہوتے ہیں' ان کا تحفظ کرنا وہ بہ خوبی جانتے ہیں' اور اس آگاہی اور شعور کے ساتھ ساتھ وہ اس کے تحفظ کی اہلیت و قوت بھی رکھتے ہیں۔

یہ بات تھوڑی سی تشریح طلب ہے۔ میں ماضی میں زیادہ پیچھے نہیں جاؤں گا' لیکن ۱۹۷۲' ۱۹۸۵ اور پھر ۱۹۹۲ کی تعلیمی پالیسیوں پر اس حوالے سے ایک نظر ڈالنے کی استدعا ضرور کروں گا۔ ۱۹۷۲ میں حکومت نے یہ انقلابی قدم اٹھایا تھا کہ دینی مدارس کو چھوڑ کر سارے ہی ابتدائی مدارس' کالج اور دوسرے عمومی تعلیم کے

نجی ادارے قومی تحویل میں لے لیے تھے۔ صرف چند "پبلک اسکول" اور "گراں فیس" وصول کرنے والے مدارس، مثلاً کراچی میں گرامر اسکول، امریکن اسکول، حبیب پبلک اسکول اور ملا اور بی-وی-ایس پارسی اسکول جیسے چند ادارے اس قومیانے کے عمل سے باہر رکھے گئے تھے۔ اب یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔ اگر قومیانے کا مطلب یہ تھا کہ تعلیم (کم از کم ابتدائی تعلیم) کو حکومت اپنی ذمہ داری تصور کرتی تھی، اور نیت یہ تھی کہ ملک کے سبھی بچوں کو ایک معیاری تعلیم کے حصول کا موقع فراہم کیا جاتا ہے، تو مدارس کے قومیانے میں کسی طرح کا کوئی استثنیٰ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تمام مدارس کے نصاب، اساتذہ اور ماحول میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، اور مملکت کے نظریے سے ہم آہنگ ایک قومی کلچر کی بنیاد رکھنے پر توجہ ہوتی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے کوئی دو بندے اور کوئی دو بچے بالکل ایک جیسے اور ایک صلاحیت کے مالک نہیں ہوتے۔ جس طرح بچوں میں ذہانت اور صلاحیت کا فرق اور درجات، مسلمہ حقیقت ہیں، اسی طرح یہ بھی ایک سادہ حقیقت ہے کہ کوئی دو استاد بھی اپنی صلاحیت، افتاد طبع، فطری میلان اور دلچسپی، اور نتیجتاً طلبہ کی تعلیم و رہنمائی کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے۔ قومیانے کے عمل کا فطری تقاضا تو یہ تھا کہ حتی المقدور کوشش کی جاتی کہ تمام تعلیمی ادارے بتدریج یکساں نصاب، اساتذہ اور ماحول کے ذریعے یکساں معیار کے حامل بن جائیں، تاکہ مختلف نظام ہائے تعلیم کے ذریعے جو مختلف طبقات، ثقافتیں اور مختلف درجوں کے حاکمین اور محکومین کے گروہ پیدا ہوتے ہیں، اور ان کے ذریعے جو غیر اخلاقی، ظالمانہ، استحصالی نظام کی استواری عمل میں آتی ہے، اس کا ازالہ ہو سکے۔ مگر چوں کہ یہ مقصد نہ تھا اس لیے ایسا نہ ہو سکا۔

۱۹۷۷ کے فوجی انقلاب کے بعد، جس میں اسلام اور پاکستانی ثقافت کا خاصا نام لیا گیا تھا، قومی تعلیم اور تعلیمی ثقافت میں یکسانیت پیدا کرنے کے ایک ممکنہ موقع کو آہستہ آہستہ ختم کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے مارشل لا ضابطے ۱۱۸ کے تحت (جو تعلیمی حکمت عملی کا ضابطہ تھا)، تمام نجی مدارس اور کالج قومی تحویل میں لے لیے گئے تھے، اور اس ضابطے کی رو سے کسی فرد یا غیر سرکاری (نجی) ادارے کو مدرسہ یا کالج قائم کرنے کی اجازت نہ تھی، کہ تعلیم کو صرف حکومت ہی کا فریضہ قرار دیا گیا تھا۔ ۱۹۷۷ کے انقلابیوں نے یہ ضابطہ ختم تو نہیں کیا، لیکن عملاً یوں ہوا کہ تدریجاً جن انجمنوں نے اپنے ادارے واپس لینے چاہے، ان کے لیے نرم رویہ اختیار کیا گیا، اور پھر سے نجی شعبے میں تعلیمی اداروں کے اجرا کی اجازت دے دی گئی۔ اور اس کا نتیجہ اب یہ ہے کہ ملک میں مختلف الوان و اقسام کے ہزارہا مدارس اور تعلیمی ادارے قائم ہو گئے ہیں۔ ۱۹۸۵ اور پھر ۱۹۹۲ کی تعلیمی پالیسیوں میں باقاعدہ طور پر تعلیم میں نجی شعبے کے وجود کو تسلیم کیا گیا، اور اس کی ہمت افزائی کی گئی۔

چوں کہ اس میں کوئی قدغن (عملاً) نہیں ہے کہ نجی شعبوں میں قائم ہونے والے ان تعلیمی اداروں

میں کیا پڑھایا جائے گا، کون پڑھائے گا، کیا فیس لی جائے گی، ماحول کیسا ہو گا، اس لیے پورا ملک تعلیم کے شعبے میں ایک پاگل خانہ بن چکا ہے۔ جہاں بھانت بھانت کی بولیاں اور طرح طرح کی آوازیں، کسی معقول اور باشعور معاشرے کا پتا نہیں دیتیں۔ مگر "دیوانہ بکار خویش ہشیار" کے سنہرے اصول کے مطابق اس میں بھی مقتدر طبقے کی ضروریات اور مفادات کا خیال ضرور رکھا گیا ہے، اور اس کے لیے وسائل اور ذرائع (سرکاری اور نجی سطحوں پر) فراہم کرنے کا انتظام و انصرام بھی موجود ہے۔ اس طرح ملک میں تعلیمی ثقافتوں کے بے شمار رنگ پیدا ہو چکے ہیں۔

یہاں سرکاری اسکول بھی ہیں (غربا اور مساکین کے لیے) اور امرا اور طبقہ مقتدرہ کے لیے قیمتی پبلک اسکول بھی۔ "او" اور "اے" لیول والے بدیسی نصاب والے انگریزی اسکول بھی ہیں، اور دیسی اسکول بھی، اور کاروباری انداز کے مختلف درجات کے بے شمار ایسے اسکول، جو مختلف وزن کی جیب رکھنے والوں کی اولاد کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

ان سب کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں ایک تہذیبی بحران اور انتشار پیدا ہو چکا ہے اور "وحدت ملی" جس کا ذکر کرتے کرتے، علما و اساتذہ، سیاست کار اور داہنے بازو کے دانش ور، راست باز ادیب اور شاعر اور صحافی، کبھی نہیں تھکتے، ایک خواب پریشاں سے زیادہ کچھ نہیں رہی ہے۔

کعبہ، جس کی سمت، مشرق اور مغرب، شمال اور جنوب ہر طرف کے مسلمان رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں، دنیا کے سب مسلمانوں کے لیے ایک مرکز وحدت فراہم کرتا ہے، اور توحید کے علامتی اظہار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مختلف خطوں، علاقوں اور ملکوں کی ثقافتیں مختلف ہو سکتی ہیں، مگر ان کے درمیان ایک باریک اور لطیف رشتہ، مذہب اسلام کا ہے۔ اس رشتے کی دریافت، اسے محکم اور مستحکم کرنا ہی ایک اسلامی نظام تعلیم کا بنیادی وظیفہ ہونا چاہیے، جسے اب ہم گم کر بیٹھے ہیں۔

وہ رشتہ کیا ہے؟ مذہب، کائنات کے بارے میں ایک مخصوص نقطہ نظر اور رویے کا رشتہ، جس کی عملی صورت ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے تربیت یافتہ اصحاب کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ اگرچہ اپنے جغرافیائی حالات، بعد زمانی و مکانی کے باعث ہمارے اور ان کے مظاہر زندگی میں بڑے فرق ہو سکتے ہیں۔ تاہم بات اس ثقافتی روح اور رویے کی ہے، جس کی عدم موجودگی میں کوئی تعلیمی نظام، اسلامی نہیں کہلا سکتا، اور میرے خیال میں کوئی معاشرہ مسلم معاشرہ نہیں ہو سکتا۔ میرا یہ گمان بھی ہے کہ اس روح ثقافت کے بغیر، دوسری اقوام تو "ترقی" کر سکتی ہیں، جیسا کہ ہمیں مشرق بعید، یورپ اور امریکہ میں نظر آتا ہے، مگر اسے تج کر کوئی قوم، جو خود کو "مسلمان" بھی کہتی ہو کسی طرح بھی اقوام عالم میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کے بعض افراد انفرادی طور پر دنیاوی خوش حالی، عزت و مرتبے کے

کسی مقام پر پہنچ جائیں' لیکن منقسم شخصیت کے ساتھ کوئی قوم بھی بام عروج پر نہیں پہنچ سکتی۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اسلامی فکر اور نظریات پر اساس رکھنے والے مدارس اور تعلیمی اداروں میں ظاہر ہے کہ اس ثقافت کو رواج دینے کی کوشش کی جانی چاہیے' جس کا تقاضا اسلام ہم سے کرتا ہے۔ نظری طور پر اس ثقافتی روح کو طلبہ کے ذہن اور ان کی نفسیات میں جاگزیں کرنے کی ضرورت ہے' اور عملی طور پر اس کے مظاہر کو ان کی زندگیوں میں منعکس کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

لیکن آج پاکستان میں ہم اپنے بچوں کو کس طرح کے آدرشوں' تمناؤں اور اہداف کا طالب اور خوگر بنانا چاہتے ہیں' یا بنا رہے ہیں' اس کے بعض نمونے مجھے حال ہی میں بعض امتحانی کاپیوں میں نظر آئے' جن میں متعدد طلبہ نے اعتراف کیا کہ ان کی ثقافت کیا ہے' اور وہ کیا بننے کے آرزومند تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ایک بڑا عہدہ یا منصب' جس کے ساتھ گراں قدر مشاہرہ اور بہت سی مراعات ہوں۔ رہنے کے لیے طبقہ امرا کے علاقے میں ایک وسیع' کشادہ اور خوب صورت مکان' قیمتی سواری' شان دار اور باثر شریک حیات' وسیع اختیارات اور معاشرے میں عزت کا ایسا مقام جس کی سب تمنا کریں' لیکن کم ہی وہاں تک رسائی پا سکیں۔ اب قید سے ناآشنا مسرتوں کا حصول زندگی کی غایت قرار پایا ہے۔ مسرت کا آرزومند کون نہیں' اور کسے "گلشن بے خار" میں بسنے کی خواہش نہیں؟ مگر جو چیز پریشان کر دینے والی ہے' وہ یہ ہے کہ ہمارے بچوں اور نوجوانوں کو مذکورہ بالا اہداف کے حصول کے لیے کوئی بھی قیمت زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ وہ انھیں ہر طریقے پر اور ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بعض اس بات پر ضرور متوحش ہیں کہ ہماری روایتی اقدار' ہمارا مذہب اور ہمارا نظام اخلاق' ہماری بعض خواہشات کی تکمیل کی راہ میں آڑے آتے ہیں۔ لیکن بہت سوں کو اس کا شعور ہی نہیں۔ خاص طور پر وہ بچے جن میں ابھی تنقیدی حس بیدار نہیں ہوئی' وہ اپنے گھریلو ماحول' مدرسے کی فضا اور ذرائع ابلاغ (خصوصاً ٹی وی) میں جس دنیا کو دیکھتے ہیں' جیسی کوٹھیاں' کاریں' باغ' دفتر' حوریں' غلمان' لباس' خوردونوش' تفریحات اور مشاغل اور دوسرے اسٹائل وہاں انھیں نظر آتے ہیں' انھی کے معیار پر خود کو لے جانے یا ترفع اور حرکت عمودی کے ذریعے انھیں پالینے کی خواہش کرتے ہیں۔ جو اسے حاصل نہیں کرپاتے' سخت فرسٹریشن کا شکار ہو جاتے ہیں' یا جرائم (بشمول "سفید کالر جرائم") کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ اور جو نوجوان معیار زندگی کی اور مادی آسودگی کی ایک نام نہاد بلند سطح تک پہنچ چکے ہیں' وہ اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں' میں نے بعض بچیوں سے ایک وضاحت بطور جواب چاہی: میں پردہ کیوں نہیں کرتی؟ ان

میں سے شاید ہی کسی نے یہ جواب دیا کہ بے حجابی اسلامی احکام سے متصادم نہیں، اس لیے میں بے حجاب ہونے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتی۔ اکثر نے اس کا اعتراف کیا کہ اسلام کی اقدار، حجاب کا تقاضا کرتی ہیں، لیکن ان کا کہنا تھا کہ ہمارا گھریلو اور سماجی ماحول، ہمارے تعلیمی اداروں کی عمومی فضا اور ہماری دنیا ایسی ہے کہ حجاب کے ساتھ ہم اس میں نکو اور پس ماندہ محسوس ہوں گی۔ ہم اپنے سماجی دباؤ کے آگے بے بس ہیں۔ اگرچہ بعض نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ حجاب اختیار کرنے کے بارے میں غور کریں گی۔

میں نے حجاب کا مسئلہ محض ایک مثال کے طور پر اٹھایا ہے۔ ثقافتی طور پر یہ اہم ترین مسئلہ نہیں، گو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکام کے بعد اس سلسلے میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ہمارا عمومی سوال یہ ہے کہ وہ معیار اقدار کیا ہے، جس پر ہم اپنی اور اپنے بچوں کے کردار کی بنیاد رکھیں۔ کیا اس یا پھر ان اقداری معیارات کا تعین ہمارے سماجی اور معاشی ڈھانچے، مثلاً دولت، معاشرتی رتبے وغیرہ کریں گے؟ یا کوئی ایسے آفاقی اصول ہیں، جن کی روشنی میں ان اقدار کا تعین کیا جائے گا، جنھیں ہم اپنے تعلیمی اداروں کے ذریعے فروغ دینا چاہیں گے، اور جن کے نتیجے میں ہم اپنے زمنی اور عصری تقاضوں کے پیش نظر ایک مخصوص ثقافت کی ترویج کی کوشش کریں گے؟

تقسیم ہند سے پہلے، بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک برعظیم میں مسلمانوں کی ثقافت کی بڑی حریف، ہندوانہ ثقافت تھی، جس کے اثرات ایک حد تک لباس، طعام، زبان اور رہایش، میلوں ٹھیلوں اور تفریحات میں بھی آ گئے تھے۔ لیکن اس کی طرف سے کوئی سنجیدہ چیلنج کبھی پیش نہیں آیا۔ اس طرح انگریزوں کی لائی ہوئی مغربی تہذیب اور ثقافت نے بھی ایک محدود اقلیت کے علاوہ عوام کی اکثریت میں اپنا اثر و نفوذ پیدا نہ کیا۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد، خاص طور پر بیسویں صدی کے چھٹے عشرے سے مغرب کی جو تہذیبی اور ثقافتی یلغار شروع ہوئی ہے، اس نے ہماری اقدار کے نظام میں بری طرح شکست و ریخت کی ہے، اور اس کا بڑا آلہ کار آفسٹ چھپائی کا پرنٹ میڈیا، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ اور اطلاعی فنیات (information technology) کے وسائل ہیں، جنھوں نے ہمارے گھروں میں نقب لگائی ہے۔ "ای میل" کے ذریعے بلاطلب نامطلوب مواد ہمارے گھروں میں پہنچ رہا ہے، اور بعض خواتین و حضرات برقیاتی وسائل کے ذریعے اپنے "نجی مشاغل" میں آپ کو شریک کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی ظواہر ہی میں نہیں بلکہ جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، باطن میں بھی آئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ ظاہر اور باطن کا معاملہ یوں سادہ سا نہیں کہ انسان کا باطن اس کے ظاہر کو متعین کرتا ہے۔ یہ تو ہے ہی۔ مگر صورت یوں بھی ہے کہ انسان کا ظاہر اور اس کے ظاہری اعمال بھی اس کے باطن کو متعین کرتے ہیں۔ یہاں میں جملہ معترضہ کے طور پر یہ کہتا چلوں کہ حضرت عمرؓ اس نکتے سے خوب واقف تھے۔ جب انھوں نے بیت المقدس کی فتح کے موقع پر

قیمتی لباس اور شان دار سواری کے استعمال سے انکار کر دیا تھا کہ ان سے نفس میں رعونت پیدا ہوتی ہے۔ اپنے عمال اور اعلیٰ سرکاری عہدے داروں کو "نفیس اور قیمتی لباس زیب تن کرنے اور چھنے ہوئے باریک آٹے کی روٹی کھانے" شان دار عمارتوں میں رہایش اختیار کرنے اور دربانوں اور ہٹو بچو کے پروٹوکول سے حکماً منع کر دیا تھا' کیا وہ آیت شریفہ سے واقف نہ تھے' جس میں کہا گیا تھا: "کہہ دیجیے' کس نے زیب و زینت کی وہ چیزیں ممنوع قرار دے دی ہیں' جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں' اور کھانے پینے کی چیزوں میں سے "طیبات" کو کس نے حرام قرار دے دیا ہے....؟ (الاعراف ۷: ۳۲)

یہ سب ٹھیک ہے' یہاں سوال حلال و حرام کا نہیں' بلکہ مطلوب و غیر مطلوب کا ہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم میں وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا' جو شکم سیر ہو کر کھانا کھائے' اور اس کا پڑوسی بھوکا سوئے' تو یہاں بھی سوال حلال و حرام کا نہیں ہے۔ ساتر لباس' حرام اور ممنوع نہیں' اور نہ دنیا کی کوئی زبان ناجائز ہے۔ لیکن قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اپنے تعلیمی اداروں میں (اور اپنے گھروں میں) ہم اپنے بچوں کو جو یونی فارم اور کپڑے پہناتے ہیں' جس نشست و برخواست کا عادی بناتے ہیں' جس زبان اور لہجے میں گفتگو کرنا سکھاتے ہیں' جن حرکات' سکنات اور اشارات کو ان کے لیے نمونہ بناتے ہیں' وہ سب ان کی سائیکی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں۔

مغرب کے علمی' سائنسی' صنعتی' تجارتی اور مالیاتی نظام نے جس کلچر کو فروغ دیا ہے' وہ انسان کی مطلقاً آزادی کا کلچر ہے۔ اور یہی ثقافتی فضا ایک زہریلے دھوئیں کی طرح اب ساری دنیا پر مسلط ہو گئی ہے۔ اس کے مطابق انسان' حیوانات کی لاکھوں انواع میں سے کامیاب ترین نوع ہے۔ وہ فطرت کے طبعی' حیاتی قوانین کے تحت وجود میں آگیا ہے۔ اور اپنے سوا کسی کے آگے جواب دہ نہیں کہ اس سے بڑھ کر معلوم کائنات میں کوئی ہستی نہیں ہے۔ وہ کاملاً خود مختار اور مطلقاً آزاد ہے۔ اپنا برا بھلا خود سمجھتا ہے' اور اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ خارج سے اس پر کوئی قدغن اور روک ٹوک نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ اپنا ضابطہ کردار اور منہاج حیات خود ہی متعین کرے گا' کیوں کہ اس سے ماورا کوئی ایسا وجود ہے ہی نہیں' جو اس کی ہدایت و رہنمائی کر سکے۔

انسان اور کائنات کے بارے میں اس مابعد الطبیعی نقطہ نظر نے جس تہذیب و ثقافت کی صورت گری کی ہے' اس کا مرکزی حوالہ "استحصال" ہے۔ سائنس و فنیات کے ذریعے طبعی حالات میں تبدیلیاں لانے کی قدرت' مواصلاتی نظاموں میں انقلابی تبدیلیاں' جن کے ذریعے فاصلے سمٹ گئے' اور اطلاعاتی فنیات' جس کے ذریعے علم کی لامحدود مقدار تک رسائی ممکن ہو گئی ہے' ان سب نے مل کر مقتدر انسان کو ایک طاقت ور اور حریص عفریت کی صورت دے دی ہے' جو نہ صرف فطرت اور اس کے خزانوں کے استحصال میں

معروف ہے' بلکہ اپنے بنی نوع میں سے بھی نسبتاً کمزور اور کم طاقت ور اکثریت کو اپنی حرص و طمع اور لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بناتا ہے۔ نفع عاجل اور غلبے کی ہوس میں مسابقت' اس انجن کے بنیادی ایندھن ہیں' اور ان کی تیاری' رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے ذریعے ایک عالمی کلچر کو فروغ دے رہی ہے۔

اب تعلیم وثقافت کے ذریعے "کامیابی" کو لیجیے۔

تعلیم اور تعلیمی اداروں میں ایک تہذیب وثقافت کے فروغ کے حوالے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم بچوں کو تعلیم کیوں دیتے ہیں؟ اس کے کئی جواب ہو سکتے ہیں' لیکن ایک عمومی جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم انھیں "کامیاب" دیکھنا چاہتے ہیں۔ کامیابی کا ایک محدود مفہوم تو وہ ہے جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ وہ ایک مخصوص ثقافت کی پیداوار ہے' جو خود بھی ایک مخصوص ثقافت کو جنم دیتی ہے' لیکن قرآن مجید جو ہماری رہنمائی کے لیے حوالے کی بنیادی کتاب ہے' کامیابی کے اس تصور کو رد کرتا ہے اور اسے "متاع حیات دنیا" یعنی دنیا کی زندگی کا ایک عارضی فائدہ قرار دیتا ہے۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (اٰل عمرٰن ۳: ۱۴)

لوگوں کے لیے مرغوبات نفس --- عورتیں' اولاد' سونے چاندی کے ڈھیر (مال و دولت)' چیدہ گھوڑے (شان دار سواریاں) مویشی اور زرعی زمینیں (ذرائع پیداوار) --- بہت خوش آیند بنا دی گئی ہیں' مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے عارضی سامان ہیں۔

حقیقی کامیابی رضاے الٰہی کے حصول کی کامیابی ہے' جو فرد کے ذاتی ترفع کی بجائے مجموعی طور پر تمام انسانوں' بلکہ اللہ کی تمام مخلوق کی بھلائی کو اپنا محور بناتی ہے' اور افراد اور گروہوں کے درمیان چھین جھپٹ اور کشاکش سے گریز کا رویہ سکھانے والی ثقافت ہے۔ اس طرح ہر وہ ادارہ' جو ایسے کلچر کو فروغ دے' جو ان اہداف کے حصول میں ممد و معاون ہو' ہمارے لیے مطلوب ادارہ ہو گا۔

مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس ثقافت کی بنیاد' توحیدی نظام عقائد اور اس الہامی مابعد الطبیعیات پر ہو گا' جو صحیح اسلامی فکر ہی میں پایا جاتا ہے۔

سولھویں' سترھویں صدی عیسوی میں' بقول ٹائن بی' انگریزوں نے بادشاہ اور خدا' دونوں کو قتل کر دیا' اور دونوں' عملاً ان کی زندگی سے باہر ہو گئے۔ مگر ان کی جگہ دوسرے خبیث اور پلید خداؤں نے لے لی' جن میں قومیت' حصول مسرت کی غایت اور کلی غلبے اور اقتدار کی خواہش پیش پیش ہیں اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' عالمی ثقافت (global culture)' جس کا ہم بھی شکار ہیں' انھی دیوی' دیوتاؤں کی پیداوار ہے۔ ہمیں ان کا منحوس غلبہ ختم کر کے نظام فکر میں توحید کو اس کے حقیقی معنوں میں رائج کرنا ہو گا' کہ اسی طرح

دنیا (اور اپنے معاشرے کو) افتراق و انتشار' چھین جھپٹ' ظلم و استحصال اور زبردستوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ توحید کے حقیقی معنی کیا ہیں!

۱- یہ کہ کائنات کا خالق اور حقیقی مالک صرف اللہ ہے۔

۲- کائنات کی تمام اشیا اور موجودات' بشمول انسان' اسی کے تکوینی حکم کے تابع ہیں۔

۳- انسان' چوں کہ ایک باشعور ہستی ہے' اس لیے اس کے لیے لازم ہے کہ تکوینی اطاعت (جس میں جمادات و نباتات بھی اس کے شریک ہیں) کے علاوہ شعور و اختیار کے میدان میں اس کی شعوری اور ارادی اطاعت بھی قبول کرے۔

۴- ارادی اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی تمام موجودات کے ساتھ انسان کا تعلق ان حدود کا پابند ہو' جو اللہ نے متعین کی ہیں۔

۵- ارادی اطاعت کا یہ بھی مطلب ہے کہ افراد انسانی' انسانی گروہوں اور فرد اور جماعت کے باہمی تعلقات اس نہج پر استوار ہوں' جن کو اللہ تعالیٰ نے اجمال یا صراحت کے ساتھ متعین کر دیا ہے۔

۶- فرد کے لیے اقدار میں مطلوب و نامطلوب اور قبول و رد کا معیار بھی الہامی ہدایت کی روشنی میں ترتیب دیا جائے۔

۷- فرد کی حتمی اور آخری غایت' کائنات کی واحد مقتدر ہستی' ذات الٰہی کی رضا کا حصول ہو۔ وہ اس شعور و عقل کی روشنی میں' جو خود اللہ نے اسے عطا کی ہے' اللہ کا محب اور اس کا محبوب بننے کی کوشش کرے۔

ایک مسلم کی حیثیت سے اس نظام فکر کی مادی ہیئت اور جسمانی ظہور' حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ہے۔ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ آپؐ اللہ کی بہترین مخلوق ہیں۔ آپؐ کی ذات کامل ایک انسان کے لیے نمونہ ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱)' یعنی رسولؐ کی ذات میں تمھارے لیے بہترین مثال اور نمونہ موجود ہے' کا یہی مفہوم ہے۔ افلاطون نے عالم تصورات کا ایک الگ عالم بتایا ہے' جس میں ہر تصور' اپنی نوع کے کامل نمونے کی نمایندگی کرتا ہے۔ مسلم مفکرین اور فلاسفہ نے "انسان کامل" کا تصور پیش کیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارا رہبر' ماقبل تاریخ نہیں' بلکہ تاریخی عہد کی روشنی میں' اور ایسے انسانوں کے درمیان رہا' جو اپنی یادداشت کے لیے شہرت رکھتے تھے' اور دور جاہلیت میں اصنام پرستی کے باوجود ان کے سادہ ذہن' اساطیر اور دیومالائی تخلیقات وضع کرنے سے پاک تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس "خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" (اللہ کی بہترین مخلوق) کی بود و باش' رفتار و گفتار اور فکر و خیال کا ایک اہم اور قابل ذکر حصہ محفوظ رہ گیا ہے' جس کی اپنے سیاق و سباق سے ہٹ کر کورانہ تقلید اور نقل کرنے کے بجائے اس کی روشنی میں ہم اپنی زندگی کو استوار کر سکتے ہیں' اور اپنے حالات کے مطابق ایسی

تہذیب و ثقافت کو جنم دے سکتے ہیں' جو "مزاج رسولؐ" سے ہم آہنگ اور اس سے قریب تر ہو۔

مندرجہ بالا مقاصد کو سامنے رکھ کر نہ صرف مدارس اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نصاب میں' بلکہ ان کے ماحول میں بھی ایسی تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں' جو مجموعی طور پر ہمارے طلبہ کی زندگی کو زیادہ بامعنیٰ' صاف ستھری اور اعلیٰ مقاصد سے ہم آہنگ بنا سکے۔

طلبہ میں ساری کائنات اور موجودات کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق سمجھنے کا شعور اس طرح پیدا کیا جائے کہ وہ عالم فطری کو اپنا حریف اور دشمن یا لاوارث کا مال سمجھ کر اسے لوٹنے کھسوٹنے اور اس کا استحصال کرنے کی بجائے اپنا دوست اور ساتھی سمجھیں۔ اپنی ملکیت اور دوسری چیزوں کو اللہ کی امانت سمجھ کر استعمال کریں۔ کفایت اور قناعت کی عادت ڈالیں۔ مگر اس کے لیے مدارس کا ماحول سازگار یا ناسازگار ہو سکتا ہے۔ عالی شان مدارس اور اعلیٰ تعلیم کے "شان دار" ادارے' جو قیمتی فرنیچر اور سازوسامان سے آراستہ ہوں' جن میں کمروں کو ٹھنڈا اور گرم کرنے کے لیے برقی توانائی کا بے تحاشا استعمال ہو رہا ہو' دن کے وقت کمروں میں پردے ڈال کر ہر کمرۂ جماعت میں درجن بھر ٹیوب لائٹس روشن کر دی جائیں' سادہ چاک اور تختہ سیاہ کی بجائے درآمد شدہ قیمتی قلم اور تختہ سفید استعمال ہوں' ابتدائی جماعتوں میں سلیٹ اور تختی کی جگہ' جس پر بار بار لکھ کر مٹایا اور دوبارہ لکھا جا سکتا ہے' کاپی' پنسل' بال پن استعمال کرائے جاتے ہوں' جنھیں استعمال کر کے پھینک دیا جاتا ہے (اب مدارس میں ڈیسک پر روشنائی کی دواتوں کا رواج متروک ہو چکا ہے)۔ استعمال کرو اور پھینک دو کی ثقافت (culture of the disposable) جہاں ایک ایک مضمون کے لیے کئی کئی قیمتی کاپیوں اور رجسٹروں کا خریدنا لازم قرار دیا گیا ہو' بچوں کے بستے سادہ موٹے کپڑے کی تھیلیوں کے بجائے ہم جو کوہ پیماؤں کی زنبیلیں معلوم ہوں' جو بیرونی ملکوں سے درآمد کی گئی ہیں' یا انھی کے نقشوں پر تیار کی گئی ہیں' جب بچوں کی وردیوں سے سادگی اور کفایت شعاری کی بجائے ٹھاٹھ باٹھ کی امیرانہ زندگی آشکارا ہو' اور سب سے بڑھ کر' ان کے استاد اور استانیاں جن میں سے اکثریت' یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی حسن خانے سے نکل کر آ رہی ہیں) قیمتی لباس' تصنع اور مسرفانہ طرز حیات کے نمونے نظر آئیں' ایسے ماحول میں سادگی اور کفایت شعاری کی تلقین کس طرح سودمند ثابت ہو سکتی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کے پیوند لگے کپڑوں' چھوٹے سادہ مکانوں اور تکلف اور آرائش سے عاری رہائش اور سادگی و فقر کے قصے کیوں کر قابل اعتماد اور موثر ہو سکتے ہیں؟ آج کوئی بچہ یا نوجوان' سینگ والے لال' کالے دیوؤں اور پرواز اڑتی پھرتی پریوں پر یقین نہیں کرتا' نہ ہی اصنام پرست پڑوسی' دیوی دیوتاؤں کو حقیقی کردار جانتے ہیں۔ یہ سب دلچسپ قصے اور صنمیات ہیں۔ ہمارے بچوں کے لیے بھی دور اول کے قصے' صنمیات ہی ہیں' اگرچہ مقدس' جن کے خلاف زبان کھولنا ممنوع ہے۔ اگلے لوگوں کی کہانیاں' تلقین کے لیے ہیں' تقلید کے

لیے نہیں۔ سنجیدہ اور دین دار لوگوں کی مجالس میں بھی اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ قرون اولیٰ کے بزرگوں کی تقلید آج کون کر سکتا ہے!

ٹائم میگزین کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں ہر روز ۳۵ ہزار انسان (بوڑھے' بچے اور جوان) بھوک سے مر جاتے ہیں (اور اس سے کئی گنا زیادہ علاج معالجے کی نارسائی سے)۔ جہاں یہ صورت حال ہو' وہاں اگر آپ کا بچہ ۲۰ تا ۱۰۰ روپے یا اس سے بھی زیادہ کوڑا خوری (junk food) اور مشروبات کی بوتلوں اور ڈبوں پر صرف کر دے' آدھے آدھے برگر اور کباب کھا کر پھینک دے اور بوتلوں سے چند گھونٹ لے کر انھیں کنارے ڈال دے' تو کس منہ سے ہم اسے ضیاع اور مسرفانہ طرز حیات کے کلچر سے بچا لے جائیں گے؟ تصنع' تکلف' آرائش' نمایش اور مسرفانہ طرز حیات سے تنفر پیدا کرنے اور خاکساری' سادگی' سخت کوشی' محنت اور مجاہدانہ زندگی کی عظمت پیدا کرنے کے لیے نہ صرف اساتذہ کو ایک بہتر نمونہ پیش کرنا ہو گا' بلکہ بحیثیت مجموعی تعلیمی ادارے کی فضا بھی ایسی بنانی ہو گی' جہاں یہ صفات و اقدار بالکل فطری اور ادارے کی آب و ہوا سے ہم آہنگ محسوس ہوں۔ یوں نہ ہو کہ کوئی بچہ ان موخر الذکر اوصاف و عادات کو لے کر مدرسے میں آئے تو خود کو اجنبی اور کمتر محسوس کرے۔

مگر اس کام کے کرنے کے لیے وہ قوت متخیلہ درکار ہے' جو مدرسے کی عمارات' فرنیچر اور سازو سامان سے لے کر اس کے یونی فارم اور نظم و انصرام' سب کو ایک خاص انداز پر استوار کر سکے' تاکہ بچوں میں' دوسرے مدرسوں کے بچوں کے مقابلے میں احساس کمتری بھی پیدا نہ ہو' اور وہ اپنی روایات اور ثقافت کو بہتر' برتر اور زیادہ سہولت بخش محسوس کر سکیں' ان پر فخر کر سکیں' اور ان کی حمایت و مدافعت کے لیے آمادہ ہوں۔

مسابقت کا رجحان ان داعیوں میں سے ایک ہے' جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی ترقی کی راہیں کھول دی ہیں لیکن دوسروں سے کن باتوں میں برتر بننے کی کوشش کریں' اس فیصلے کے لیے کوشش خود انسان کو کرنی پڑتی ہے۔ سارے کھیل اور امتحانات ایسی مسابقت کے اظہار ہیں۔ بدقسمتی سے مغرب سے درآمدہ "یونانی رومی کلچر" کے زیر اثر ہمارے مدارس میں (خصوصاً مہنگے اسکولوں / کالجوں اور جامعات تک میں) کھیلوں اور جسمانی صلاحیتوں کے فروغ پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے' جس کے نتیجے میں طلبہ و طالبات' جسمانی برتری ہی کو معیار فضیلت بنا لیتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں عموماً علمی فضا سرے سے مفقود ہے۔ کتب خانے یا تو محض تبرک کی خاطر ہوتے ہیں' یا نمایش کے لیے۔ ان میں اکثر طلبہ کا داخلہ ہی ممنوع ہوتا ہے۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں کتب اور جرائد کی خریداری کا رواج تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس طرح اسکول اور کالج صرف نصابی کتب کی حد تک علم کے معلی بن گئے ہیں۔ وسیع معنوں میں علم کی جستجو اور تحقیق' طلبہ تو درکنار' الا ماشاء اللہ اساتذہ میں بھی مفقود ہے کہ وہ "بے مصرف علمی ذخیرے" میں اضافے کے بجائے وقت کو ایسے مشاغل میں صرف کرنا پسند کرتے ہیں' جن کی نقد قدر ہو۔ اس طرح تعلیمی

اداروں میں سے بیشتر میں "علمی ثقافت" مفقود ہوتی جا رہی ہے' جب کہ مغرب کے کئی ملکوں میں یہ بڑی حد تک زندہ ہے۔ اس علمی ثقافت کو زندہ کرنے اور اسے توانا بنانے کے لیے کتب خانوں اور کمرۂ ہاے مطالعہ پر توجہ دینی ہو گی۔ کتب خانوں میں نئی نئی کتابوں کے اضافے' طلبہ کو ان کے مطالعے کے لیے راغب کرنے کے لیے ان کے خلاصے تیار کرانے اور ان پر بحث و مباحثے کے ذریعے یہ کام سہولت سے کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میرا ایک مشاہدہ یہ بھی ہے کہ ہمارے کلاسیکی ادب سے ہمارے طلبہ بڑی تیزی سے ناآشنا ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک اچھے تعلیمی ادارے میں' میں نے کلاس میں طلبہ سے پوچھا کہ کس نے "توبتہ النصوح" یا "باغ و بہار" پڑھی ہے؟ چالیس کی جماعت میں ایک بھی نہ نکلا جس نے ان کا مطالعہ کیا ہو' سوائے ان اقتباسات کے جو درسی کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ ایک آدھ نے بتایا کہ اس نے "مسدس مدوجزر اسلام" پڑھی ہے۔ دیوان غالب' ضرب کلیم اور بال جبریل بھی کسی نے پوری نہیں پڑھی تھی۔ ایک ذہین طالب علم' جنھیں شعر سے شغف بھی تھا' اس بات پر حیران تھے کہ حضرت جبریلؑ کے بال (hair) میں ایسی کیا بات ہے کہ کتاب کا عنوان یوں رکھا جائے۔ یہ سب خیر سے گریجویشن کی سطح کے طلبہ تھے۔ یہی حال شبلی کی سیرت النبیؐ جلد اول و دوم اور مولانا مودودی کی دینیات جیسی بنیادی کتابوں کا ہے۔ ہمارے مدارس اور کالجوں کے کم ہی طلبہ ان کے قاری ہیں۔

اس سلسلے میں میری تجویز ہے کہ ثانوی' اعلیٰ ثانوی اور گریجویشن کی سطح تک کے تعلیمی نصاب میں تدریج کے ساتھ' غیر امتحانی نصاب کا اضافہ کیا جائے' جس میں اردو کے کلاسیکی ادب' نثر و نظم' کچھ علمی اور تاریخی کتابوں اور کچھ تراجم کو شامل کیا جائے۔ اس ضمن میں شیخ سعدی کی گلستان اور بوستان (منتخب اجزا)' اقبال کی ضرب کلیم اور اسرار و رموز' ٹامس کارلائل کی "Our Heroes" اور "Hero-Worship"' افلاطون کی "Apology" اور "Crito"' سری کرشن جی کی بھگوت گیتا کے منتخب حصے' حالی کی مسدس' مولوی نذیر احمد کی توبة النصوح' مرزا فرحت اللہ بیگ کی ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی' شاہ ولی اللہ کی الفوز الکبیر (ترجمہ محمد سلیم عبداللہ)' ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی کے خطبات بہاولپور' سید سلیمان ندوی کی خطبات مدراس' شبلی کی الفاروق' سرسید اور غالب کے خطوط اور اس طرح کی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی جا سکتی ہے جنھیں مختلف درجات کے طلبہ ضرور پڑھیں۔ مندرجہ بالا کتابوں کے نام ارتجالاً ذہن میں آ گئے' ان میں بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مختلف علوم کے جرائد سے اعلیٰ ثانوی اور کالجوں کے طلبہ کو متعارف کرایا جانا ضروری ہے تاکہ وہ قدیم ورثے کے ساتھ نئی تحقیق اور علوم میں پیش رفت سے بھی آگاہ رہیں۔ اس طرح ان کا علمی افق بھی وسیع ہو گا' ان میں مطالعے کی عادات راسخ ہوں گی' اور ان کا ذہن بھی کھلے گا۔